

چراغ



خسرو وصفی

○ بارِ اوّل : ستمبر ۱۹۹۲ء
○ تعداد : ۵۰۰ (پانچسو)
○ کتابت : حافظ محمد عبدالحلیم امجد

قیمت : -/۴۰ روپے

ملنے کے پتے

○ مکتبۂ جامعۂ لمیٹیڈ، دہلی، بمبئی، علیگڈھ
○ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علیگڈھ
○ "شب چراغ" 34-3-8 مٹّوگڈہ محبوب نگر۔۵۰۹۰۰۲ (اے۔پی)
○ سیل کاؤنٹر "روزنامہ سیاست" جواہرلال نہرو روڈ۔ حیدرآباد۔

انتساب

میں اپنے اِس مجموعۂ کلام کے پہلے ایڈیشن کا انتساب والدِ محترم قاضی سیّد عثمان حُسینی داروغہ محبس، بشیر آباد (پائیگاہ) وانعامدار کوسگی مرحوم و والدۂ محترمہ مرحومہ، جن کی میں تنہا یادگار ہوں۔ محسن و مخلص، محترم جناب غلام دستگیر قُریشی صاحب آئی۔ اے۔ ایس، رٹائرڈ اور احباب میں خیرات ندیم مرحوم و سُلیمان خطیب مرحوم اور محبّ کوثر کے ناموں معنون و منسوب کرتا ہوں۔

ضامن و صفیؔ

دِل میرا شب چراغ تھا جس کو
مژۂ خوں فشاں نے چھین لیا

(ناصرؔ کاظمی)

مندرجات

دیباچہ

ڈاکٹر طیبؔ انصاری
صدر شعبۂ اردو، فارسی و عربی
گورنمنٹ کالج گلبرگہ

ضررؔ وصفی "شب چراغ" کا شاعر ایک خشک پیڑ کی صورت اس دشت و صحرا میں کھڑا ہے! اس کے اُکھڑے اُکھڑے سے انداز نے مجھے متاثر بھی کیا ہے اور متحیر بھی۔ ایک ذہنی کرب و اضطراب کے عالم میں میں نے "شب چراغ" کی نظموں کا مطالعہ شروع کیا ہے۔ مجھے اِس خشک پیڑ کے اندر ایک طرح کی رطوبت بھی محسوس ہوئی اور بقول ضررؔ وصفی، زمین کی لطافت اور فضا کی رطوبت پیڑوں کے حق میں مکمل غذا ہے! غالباً اِسی غذا نے اس خشک پیڑ کو زندہ اور توانا رکھا ہے۔ اور اسی غذا نے ان کے شاعرانہ احساسات و جذبات کی تخلیق کی ہے۔ اُنہوں نے لفظوں کے سہارے اپنے شعری ذوق کی داد دی ہے اور اوروں کے لئے احساسات کے پیکر تراشے ہیں۔ کسی اچھی شاعری کا اگر یہی مقصد اور منشأ ہے تو پھر آج کے اس نئے ماحول میں جب کہ فن کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی ہے اور شعر آزادانہ طور پر اترا رہا ہے "شب چراغ" کی شاعری قبولیتِ عام کا درجہ حاصل کرلے گی۔ یہ اِس لئے بھی ممکن ہے کہ ضررؔ وصفی نے آئی۔اے۔ رچرڈز کی دونوں ہی شرطیں پوری کی ہیں۔ آئی۔اے۔ رچرڈز نے دو باتوں پر بطورِ خاص زور دیا۔ ایک تو ابلاغ اور ترسیل کا مسئلہ، دوسرا قدر کا مسئلہ۔ جدیدیت کے آگ بیسکے دھوں میں جو شعر کا لایعنی دفتر پیش رہا تھا اس ابلا ناکامی کی بنیادی

وجہ ابلاغ و ترسیل کا مسئلہ ہی تھا۔ دوسرا قدروں کا فقدان! "شب چراغ" میں ہر چند لفظوں کی پیکر تراشی ملتی ہے لیکن لفظ اپنا مفہوم رکھتے ہیں۔ اور قاری کے لئے ابلاغ و ترسیل کا کوئی مسئلہ نہیں ہیں۔ اظہار چونکہ واضح ہے اور لفظ کی بنیاد اقدار پر رکھی گئی ہے۔ اس لئے ضرر وصفی کی شاعری فن کے لئے ضرر رساں نہیں ہے۔ بلکہ اپنے مقصد و معنی کے اعتبار سے اپنا ایک وصفِ خاص بھی رکھتی ہے، اچھوتا اور نیا!! ؎

آگ ہی آگ
رگ و پئے میں
دہکتی ہوئی آگ
اُف یہ نس نس میں
سلگتی ہوئی آگ
شدت پیاس سے
جلتے ہوئے ہونٹ
یوں شب و روز
سلگتا ہے وجود

جہاں تک اقدار کا مسئلہ ہے ضرر وصفی نے انسانیت کی تاریخ کے سب سے المناک حادثہ کو شعری لہجہ میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری مظلوم کا طرفدار بن جاتا ہے اور بربریت کے خلاف وہ آواز حق بلند کرتا ہے لہو کے چراغ ضرر وصفی کی ایک ایسی ہی درد میں ڈوبی اور لہو میں نہائی ہوئی

نظم ہے اور قاری جسے پڑھ کر لہو کے آنسو روتا اور سینہ کوبی کرتا ہے۔ ے

حسینؓ دشتِ بلا میں ہیں سر کٹائے ہوئے

شاعر یہاں ماتم کناں ہے لیکن وہ صرف سینہ کوبی کو اپنا فرض نہیں جانتا وہ جانتا ہیکہ انسانی قدریں تقاضۂ حیات کر رہی ہیں وہ عزم و ہمت پیدا کر رہی ہیں اور حق و صداقت کے افتخار و فراز کا احساس جگا رہی ہیں۔ ے

صداقتوں کے امین سر جھکا نہیں سکتے

صداقتوں کے لئے سر کٹائے جاتے ہیں

ہزار فتنے شبِ تار نے اٹھائے مگر

شاعری ہے۔ اس لئے مجھے "شب چراغ" میں نور کی ایسی کرنیں نظر آتی ہیں جو
انھیں ناموری بھی اور مقبولیت عطا کر سکتی ہیں۔

[illegible] مجھے ایک یاد، بوڑھے، کرب، تیرگی،
موت، آدمی، اور پتھر کا ترانہ نے متاثر کیا ہے۔ آخری چار نظموں میں مجھے
لگتا ہے زندگی کا مثبت انداز عدم تحفظ اور مایوسی کے احساس سے سرابور
ہے۔ پتھر کا ترانہ لفظوں کی بازیگری کا اچھا نمونہ ہے۔ تکرار اور اظہار نے
مجھے متاثر کیا ہے۔

غزل اردو شعر کی سب سے زیادہ محبوب بھی اور معتوب صنف رہی ہے
رشید احمد صدیقی نے اردو غزل کو ہماری تہذیب قرار دیا اور ہم ایسے قلندروں
[illegible] غزل ہماری نفسیاتی
ضرورت ہی ہے ہم اسے نہ چاہتے ہوئے بھی چاہتے ہیں، دل و جان سے عزیز
تر۔ اردو غزل اگر قابل گردن زدنی ٹھہری تو اصل میں ہم کسی صنفِ ادب کے
خلاف نہیں ہیں بلکہ وہ فکر و خیال ہیں جو اس صنف میں سمو دیے گئے ہیں۔
[illegible] اردو غزل محمد قلی قطب
شاہ معانی سے لیکر [illegible] غالب تک اور پھر عہدِ جدید کے شعرا
تک ہمارے سفلی جذبات کی آئینہ دار رہی ہے اسی وجہ سے اس کے خلاف
آواز بلند ہوئی۔ یہ کارنامہ سب سے پہلے حالی نے انجام دیا۔ اس کا نتیجہ
یہ ہے کہ آج یہاں ایسا ایک دیدہ ور شاعر ہمارے یہاں پیدا ہوا۔ دیگر شعرا کے
یہاں بھی فکر جمیل کی پرچھائیاں نمایاں ہوئیں۔ غزل [illegible]

ایک تاریخ بھی ہے ہم پچھلی صدیوں کا محاسبہ بھی غزل کی توسط سے کر سکتے ہیں ان ساری باتوں کا احساس ضرر صفی کو بھی ہے۔ وہ غزل کے مثبت رجحان کے علمبردار ہیں۔ اور ان کی غزلیں شانِ جمالی کی آئینہ اور شانِ جلالی کی ترجمان ہیں

کشمیر بے نظیر سے پنجاب و سندھ تک
تہذیب ہند و پاک کے دھارے غزل میں ہیں

پتہ نہیں کیوں ضرر صفی نے غزل کے دھاروں کو پنجاب و سندھ تک محدود کر دیا ہے حالانکہ غزل گولکنڈہ کی لونڈی پہلے بنی اور پھر اس نے دکن کی سطح مرتفع سے اتر کر شمالی ہند کے میدانوں تک اور بالآخر اس نے کشمیر کی وادی کو لبھایا مہکایا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُنیسویں صدی عیسوی میں سارا ہندستان اس کی ہتیلی میں کٹ پتلی کی طرح ناچتا تھرکتا رہا ہے۔ بیسویں صدی تو غزل کی صدی ہے۔ اسی صدی میں وہ نقطۂ عروج کو پہونچی اور اسی صدی نے غزل کو نئی معنویت عطا کی۔ ضرر صفی اسی غزل کی ایک نئی آواز ہیں اور نئی غزل کے منظر نامہ میں ان کی تلاش ممکن ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت دوہری ہے یا پھر یوں کہئیے کہ انہوں نے دو انتہا کے درمیان ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ وہ جمال پرست ہیں، یہ صحیح نہیں ہے اور یہ کہنا کہ وہ مقصد پر اتنا زور دیتے ہیں کہ شاعری پمفلٹ بن جاتی ہے ایسا بھی نہیں ہے۔ ان کے نزدیک شعر جمال و جلال کا آئینہ ہے وہ شعر کی نزاکت اور اس کے مقصد میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔ یہی شبلی کا کارنامہ ہے۔

"اکثر ہم خود اپنے نازک اور پوشیدہ جذبات سے واقف نہیں ہوتے یا ہوتے ہیں تو صرف ایک دھندلا دھندلا سا نقش نظر آتا ہے۔ شاعری ان پس پردہ چیزوں کو پیشِ نظر کر دیتی ہے۔ دھندلی چیزیں چمک اٹھتی ہیں، مٹا ہوا نقش اُجاگر ہو جاتا ہے۔ کھوئی ہوئی چیز ہاتھ آجاتی ہے۔ خود ہماری روحانی تصویر جو کسی آئینے کے ذریعے سے ہم نہیں دیکھ سکتے شاعر ہم کو دکھا دیتا ہے۔" (شعر العجم صہ ۱۷۳)

تخلیقی عمل اور شعری منصب کے بارے میں شبلیؔ کے خیالات بہت واضح ہیں اور صحیح بھی! اس واضح اور سچے شعری تصور کے ساتھ اگر ہم "شب چراغ" کا مطالعہ کریں تو تسکینِ قلب اور راحتِ دل کے ساماں ملیں گے اور افادیت و صداقت کے پہلو بھی روشن نظر آئیں گے۔ یہ صحیح ہے "شب چراغ" اس عہد کا ایک نیا شعری کارنامہ ہے۔ میں ضرور صفیؔ کی شعری صلاحیتوں اور ان کے حدود سے واقف ہوں۔ قاری کے سامنے بھی ان کی خوبیاں، خامیاں عیاں ہیں۔ تاہم روشنی کی جو کرنیں اس شعری مجموعہ سے پھوٹتی ہیں وہ زندگی کی تاریک راہوں میں جگنو کا کام کرتی ہیں۔ اس لئے یہ کسی نعمت سے کم نہیں ہے "شب چراغ" کی غزلوں سے میں نے اپنی پسند کے چند شعر تلاشے ہیں جو میرے ان خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں جن کا اظہار میں نے اپنی اس تازہ گفتگو میں کیا ہے۔ آپ کی پسند مجھ سے الگ ہو سکتی ہے اس لئے کتاب دل کھلی ہے چاہیں آپ اپنی پسند کا شعر ڈھونڈھ نکالیں تاہم مجھے یقین ہے آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ میرے اس انتخاب سے

سینہ بہ سینہ یاد فقیروں کی رہ گئی
شاہوں کے نام صفحۂ ہستی سے مٹ گئے



اصلی چہرے کو چھوڑ کر گھر پر
نقلی چہرہ مکاں سے نکلا



ولولے سرد ہی نہ پڑ جائیں
راکھ میں کچھ شرار باقی ہے



کامراں تین سو تیرہ تھے ہزاروں میں مگر
شاملِ حال پیمبرؐ کی دُعا ہو جیسے



نرغۂ باطل میں زیرِ تیغ بھی
حق کے ہونٹوں پر ہنسی اچھی لگی



میری جبیں پہ تیرے در کی خاک رہنے دے
کوئی خطاب نہ تمغہ نہ شال دے مجھ کو



ہر گام پر چراغِ ہدایت کے باوجود
اُمت کی گمرہی پہ پیمبر اُداس ہے

⁘

کرب میں ڈوبی ہوئی ہستی فرؔید
مِیؔر کا دیوان ہو کر رہ گئی

⁘

غور سے پڑھئے آپ چہرہ کو
اِس سے بہتر کوئی کتاب نہیں

⁘

آشنا کون ہے فرؔید کا یہاں
اجنبی شہر میں وہ تنہا ہے

⁘

زندگی کی سچائیاں بکھری پڑی ہیں۔ چند شرارے ہیں جو راکھ میں دبے پڑے ہیں۔ اور جو راکھ کے اُوپر سُلگنے چمکنے کی کوشش کر رہے ہیں تھوڑی سی جُستجو کے بعد وہ بھی اسی راکھ کا حصّہ بنتے جا رہے ہیں۔ فرؔید صفی نے زندگی کی ان ہی سچّائیوں کو، شراروں کو اپنے مُشاہدہ، تجربے اور تخلیقی عمل کے ذریعے شعری قالب میں ڈھال لیا ہے "شب چراغ" کے مطالعہ کے دوران آپ اپنی بساط کے مطابق اِن سچّائیوں کو پا سکتے ہیں۔ اور شراروں کو ہوا دے سکتے ہیں۔

ڈاکٹر طیّب انصاری

خُدا

اِس خرابے میں کون آئے گا
کِس کا یہ انتظار رہتا ہے
کون کس کا خیال کرتا ہے
خاک اڑتی ہوی حوادث کی
آرزو، حسرتیں، تمنّائیں
سبز سے زرد تک سفر تنہا
کیا خبر اِس کی کچھ نہیں تم کو
تم ہی روٹھے ہوے سے رہتے ہو
زیست کا دردوکرب سہتے ہو

ورنہ اک مہرباں بھی ہے اپنا
" کالے پتھر پہ
کالی چیونٹی کو
کالی راتوں میں دیکھ سکتا ہے
اپنی شہ رگ سے بھی قریب ہے وہ"
سب کی آواز سُن رہا ہے وہ
اپنے دکھ درد سب سُناؤ اسے
تم ہی روٹھے ہوئے سے رہتے ہو
ورنہ اک مہرباں بھی ہے اپنا



پیامِ آخری

کس کی خاطر یہ تخلیق عالم ہوی
زمیں، آسماں، چاند، سورج بنائے گئے
ذاتِ اقدس وہی
دو جہاں کے لئے
افتخارِ بشر
دردِ انساں لئے
فکرِ انساں میں گم
روز و شب غار میں
سالہا سال کی کچلی اِنسانیت

گُم اندھیرے میں تھی
افتخارِ بشر
محسنِ اوّلیں
از ازل تا ابد
اِس اندھیرے میں جیسے کوئی نور ہے
وہ پیامِ آخری
تا بہ حدِ نظر جس طرف دیکھئے
جلوۂ طور ہے

⁂

مہک

اک مہک
ساتھ تھی
دیر تک میری سانسیں مہکتی رہیں
دل دھڑکتا رہا
سانس چلتی رہی
سانس جب رک گئی
نبض خاموش تھی
نظریں بے نور تھیں
کوئی آہٹ نہ حرکت نہ جنبش ہے اب
وہ مہک کیا ہوئی؟

⁂

جَھلک

آدمی

جہد

ارتقا

نور

سایہ

سفر

راستہ

زندگی

آدمی

بسِ کائنات

رات دن کا سفر
بے کراں زندگی
بے اماں زندگی
بے نشاں زندگی
بے کراں فاصلے
بے کراں سلسلے
ٹوٹتے حوصلے
نور سے نار تک
سبز سے زرد تک
اک عمل ہے یہ کیا
کتنی صدیاں ہوئیں
قید گردش میں ہیں
از ازل تا ابد
سینکڑوں ماہ و سال
کب ملیں کیا پتہ

یہ دہکتی زمیں
آسماں ہے دھواں
رات دن کا سفر
ختم ہوگا کہاں
چاند، سورج، زمیں
گردشِ ماہ و سال
گردشیں وقت کی
کس کی حکمت ہے یہ
کون ہے یہ پسِ کائنات

٭

خُشک پیڑ

زمیں کی لطافت
فضا کی رطوبت
پیڑوں کے حق میں
مکمل غذا ہے
مگر میں وہ سوکھا ہوا
پیڑ ہوں
کہ مٹی کے تودوں میں
پوشیدہ دیمک
مجھے چاٹتی ہے
میں نا آشنائے
لطافت، رطوبت

✣

شکستِ خوابؔ

چاہتوں کا کرب
نس نس میں رواں
لہراتے ناگوں کی طرح
اِک سراپا مست ناگن
کی طرح رقصاں تھی وہ
حسرتیں جاگیں کہ
خوابوں کی کوئی تعبیر ہے
خواب ہے، نا خواب کی تعبیر ہے
یہ تو اک
دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر ہے

⁂

تغیُّر

کرب، خموشی
کھوکھلے قہقہے
میری صدی کا آدمی
تنہا اداس
کالے اُجلے، اُودھے نیلے
رنگ بدلتا آکاش
تپتے ہوئے آہن کی طرح
ضمیرِ ارض
دہکتا ہوا اک انگارہ
کہیں پہ زلزلے سیلاب قحط لوٹتا ہوا
ہر اک شخص ہراساں دکھائی دیتا ہے۔
یہیں پہ آج ہی روزِ حساب ہو جیسے

✤

پرندے

فضا ساکت
فلک خاموش
زمیں چُپ ہے
سمندر نے کسی طوفان کا شائد
آج کوئی خواب دیکھا ہے
پرندے سب
جزیروں سے نکل کر
دشت و صحرا کی طرف آئے
زمیں و آسماں کی کیفیت ساری
اُچٹتی سی نگاہیں ڈال کر پہچان لیتے ہیں
پرندے ہر نئی آہٹ کا
مطلب جان لیتے ہیں

••

نئے تقاضے

کھلی ہوی ہے کتابِ ماضی
ہر ایک تحریر بولتی ہے
ورق ورق پر دمکتے چہرے
ہر ایک تصویر بولتی ہے
یاد بیتے دنوں کی جیسے
جیب و داماں کی دھجیوں سے
لہو کی بوندیں ٹپک رہی ہیں
نئی ہے منزل نیا سفر ہے
نئی اُمنگیں، نئے ارادے
کھلی ہوی ہے کتابِ ماضی
بوڑھے چہروں کی جھریوں سے
نئے تقاضے جھلک رہے ہیں
جیب و داماں کی دھجیوں سے
لہو کے قطرے ٹپک رہے ہیں
زمیں کو گلزار کر رہے ہیں

لہو کے چراغ

یہ کارواں ہیں ہمارے لُٹے لُٹائے ہوئے
خود اپنے راہبروں کا فریب کھائے ہوئے
صلیب و دار و رسن سب میں آزمائے ہوئے
حُسینؑ دشتِ بلا میں ہیں سر کٹائے ہوئے
صداقتوں کے امیں سر جُھکا نہیں سکتے
صداقتوں کے لئے سر کٹائے جاتے ہیں
ہزار فتنے شبِ تار نے اٹھائے مگر
چراغ ہم تو لہو کے جلائے جاتے ہیں
حُضورِ حق وہی صد افتخارِ ناز ہوا
کٹا جو حق کے لئے سر وہی فراز ہوا

٭

قول و قسم

گاؤں کا میدان میلے کا ہجوم
رنگینیاں ، رعنائیاں
خواہش ، انگڑائیاں
ایک تنکے کی طرح
جذبات کے ریلے میں ہیں
بہتے ہوئے سب نوجواں
خواہشوں کے بوجھ سے
بوجھل بدن
کھا رہے ہیں پھر کسی
میلے میں ملنے کی قسم

بَونے

دشت میں رواں جیسے
اک ہجوم بونوں کا
چلتے چلتے رستے میں
ایک بُلند ٹیلے پر
اژدہام بونوں کا
اس بلند ٹیلے پر
چڑھ کے قد بڑھائیں کچھ
فکر میں تھا ہر بونا
جہد، سعئ لاحاصل
اپنا قد بڑھانے کی
قد کے ساتھ بونوں کی
عقل بھی تو کوتاہ ہے

٭

ایک یاد

صاف ستھرے کنول کی طرح
تالاب کے گندے پانی میں
اجنبی شہر کی بے سروسامانی میں
ایک وقت کے کھانے کے لئے
دن بھر کی
تھکا دینے والی محنت کے بعد
فٹ پاتھ پہ بسر ہوتی ہوی
یہ رات
نیند سے محروم آنکھیں
اُف یہ ڈستی ہوی
عظمتِ اجداد کی یاد

٭

ایک نوحہ

کدھر گئے کہاں ہو تم
در بہ در کی ٹھوکریں
نفرتیں، عداوتیں
اُلجھنیں، حقارتیں
روز و شب اذیتیں
یہ کرب کیسا کرب ہے
وجود ایک خشک پیڑ
جل رہا ہے صبح شام
کہاں ہو تم، کہاں ہو تم
کہ دشتِ غم میں آج تو
بوند کو ترس گیا
عظیم ماں کا پیار
کہاں گیا کدھر گیا
شفیق ماں ترے بغیر
دس برس گذر گئے

☆

آگ

آگ ہی آگ
رگ و پئے میں
دہکتی ہوی آگ
اُف یہ نس نس میں
سُلگتی ہوی آگ
شدتِ پیاس سے
جلتے ہوے ہونٹ

یوں شب و روز
سُلگتا ہے وجود
جیسے خاشاک کے
انبار سُلگ اُٹھے ہوں
مُجھ میں جو پیاس ہے
بُجھتی ہی نہیں
میں کہ شعلوں میں
گھرا رہتا ہوں

☆

خیرات ندیم کے نام

تیرا احسان بھلا سکتا نہیں
میں ترے پیار کا اخلاص کا شیدائی ہوں
نقش ہیں دل پہ ابھی تک تازہ
ترے اخلاص و محبت کے مہربانی کے
تری چاہت کے، مروّت کے وفاداری کے
خوشبو باقی ہے ترو تازہ گلابوں کی طرح
اُن ملاقات کے لمحوں کی ابھی
جو ترے ساتھ گذارے تھے کبھی
تری نظموں تری غزلوں میں مہک باقی ہے
اپنی تخلیق کے
ہر لفظ میں زندہ ہے تو
ترے مرنے کی خبر جھوٹی ہے

⁂

مانگ کا سیندور

ساگر کے کھارے پانی میں مِل کر
دریاؤں کا میٹھا پانی
گدلا اور کھارا ہو جاتا ہے
دیش پرایا ہو جاتا ہے
دھنک کے رنگ آکاش پر لہراتے ہیں
اشوک اور گوتم کی یہ دھرتی
آزادی کے نعروں سے گونج اٹھتی ہے

کرشنؔ کی بانسری
کبیرؔ کے دوہے
تلسیؔ کے گیت
چشتیؔ کی وحدانیت
عدم تشدد اور اہنسا کی مشعل لے کر
اندھیروں پر ہم فتح پا لیتے ہیں
آزادی کی دیوی
اپنے سُنہرے بالوں کو بکھرائے کھڑی ہے
ایک جیالا
اپنی دُور اندیشی اور دانائی سے
ان بکھرے بالوں کو گُوندکر
مانگ میں سیندور بھر دیتا ہے
دستور مکمل کر دیتا ہے

⁘

ڈاکٹر امبیڈکر کے نام

اک تناور درخت کی مانند
تو نے بخشے ہیں قوم کو سائے
تیرا احسان مند ہے بھارت
فیصلے تھے ترے ہمالیہ کی طرح
اپنے ہمسایوں میں بلند ہے بھارت
ایسا دستور دے دیا تو نے
قوم صدیوں سے تھی اندھیرے میں
اُس کو اک نور دے دیا تو نے

❁

دستِ بُریدہ

حال کی فکر ہے نہ مُستقبل
راہ تھی کونسی کہاں منزل
زندگی صرف
غم ہی غم کا یقیں
ہے تصور کسی خوشی کا محال
حادثہ یہ تو اتفاقی ہے

زندگی اور کتنی باقی ہے

گھر فسادات میں جلا لیکن

گھر کے شعلوں سے بچ نکلنا بھی

المیہ ہے عجیب اک لیکن

بھیڑیے بن گئے تھے کچھ انساں

صرف اک داغ دار چہرہ ہے

ناک نقشہ تو کچھ نہیں باقی

تلخ تر زندگی ہے جاں باقی

کس توقع پہ دل کو بہلائیں

اب منجم بھی کیا بتائے گا

دیکھ کر ان بریدہ ہاتھوں کو

آنے والے دنوں کی باتوں کو

٭

کھنڈر

سینۂ شب کو اُدھیڑتی ہوئی
سانسوں کی صدا
سایہ اک سائے پہ منڈلاتا ہوا
جیسے مُردار پہ گدھ منڈلائیں
اس اندھیرے میں یہ ویران کھنڈر

ہلکی آہٹ پہ
یہ جنگلی کبوتر جیسے
ان گنت تیر
دراڑوں سے نکل جاتے ہیں
دم بہ خود سہمے ہوئے
جگنو خاموش تماشائی ہیں
لمس لذت کا نشہ
جسم سے روح میں ڈھلنے کیلئے
قُرب کی آگ میں تپ تپ کے
پگھل جاتا ہے
سینۂ شب کو اُدھڑتی ہوئی
سانسوں کی صدا

∴

آواز

ہر گھڑی ہنگامۂ روز و شب میں
ایک آواز میرے ساتھ رہی
نبض چلتی ہوئی تلوار کوئی
کربِ لمحات سے کراہتا بدن
ایک آواز میرے ساتھ رہی
میری مونس میری غم خوار رہی
کبھی قاتل کی طرح برسرِ پیکار رہی
یہی آواز میرے ساتھ رہی
یہی آواز میرا جسم میری روح بھی ہے
یہی آواز بنی میرا وجود
یہی آواز ہے آفاق میں پہچان میری

❖

کربِ تیرگی

حصارِ ذات کے اندر
اندھیرا ہی اندھیرا ہے
و گھٹن ہے حبس کی سی
اُلجھنیں ہیں اضطرابی ہے
نہ سورج کی کرن کوئی
حصارِ ذات کے اندر
بتا مجھ اے اندھیرے کے سمندر
تری تہ میں
کوئی ایسا گُہر بھی ہے
جو سورج کی طرح بخشے
حرارت روشنی مجھ کو

٭

لہو سفید ہوگیا

لہو کا رنگ ایک ہے
لہو تو سب کا لال ہے
میری صدی کا معجزہ
لہو سفید ہوگیا
عجیب ظلم و قہر ہے
نفرتوں کا زہر ہے

آگ ہے لگی ہوی
مکاں ، مکاں
دھواں ، دھواں
جُھلس رہے ہیں
جسم و جاں
بُغض ، نفرتیں ، قہر
قتل و خوں شہر شہر
خلوص ہے نہ پیار ہے
دھرم ہے نہ دین ہے
ضمیرِ عصر میں یہ کون
عجیب زہر بو گیا
عذاب جھیلتے رہو
نفرتوں کے کرب کا
میری صدی کا مُعجزہ
لہو سفید ہو گیا

☆

مَوت

خوف ناک آنکھیں ہیں
مُتلاشی کسی کی
نہ جانے کِس کا ہے
یہ انتظار
مصنوعی سانسوں کا اب ہے
آکسیجن پہ مدار
آخری ہچکی کے جیسے
مُنتظر ہیں رشتہ دار

آدمی

سطح پر تھا بُلبُلا
ایک پل کا رقص تھا
ایک پل کی آرزو
ایک پل کی جستجو
ہلکی لہر سی اُٹھی
بُلبلے کا سطح سے
وجود مٹ کے رہ گیا
وقفۂ حیات اِک
بُلبلا ہے سطح کا
کریم تو رحیم تو
سمندرِ عظیم تو
جزیرۂ فنا ہوں میں
ازل کا اِک گُناہ ہوں میں

٭

پتھر کا ترانہ

دیوانگی کے ہاتھ میں
وحشت کا پتھر ہے
کہیں نفرت کا پتھر ہے
صلہ چاہت کا پتھر ہے
کہیں پتھرائی آنکھوں میں
بنی ہے پیاس بھی پتھر
کنویں میں آب بھی پتھر
میری نظروں سے دیکھو تو
یہ بہتی آب کی چادر بھی پتھر ہے
زمیں سے آسماں تک
ہر جگہ پتھر ہی پتھر ہیں

گدا کے ہاتھ میں پتھر
شہی کے تاج میں پتھر
پہاڑ اور دشت پتھر کے
شہر اور گاؤں پتھر کے
تلاشِ یار میں صدیوں
تراشے غار پتھر کے
کبھی تعمیر پتھر سے
کبھی تخریب پتھر سے
بنی تہذیب پتھر کی
بنے ہتھیار پتھر کے
کبھی تھے برتن و زیور بھی پتھر کے
کماں و تیر پتھر کے
زمانہ جن کو صدیوں یاد رکھیگا
ہوئے ایسے بھی پیدا تاج کے خالق
یہاں معمار پتھر کے

پیامِ اشوک و گوتم بھی
کندہ پتھروں پر ہے
اجنتا میں جمالِ حُسن زندہ
پتھروں پر ہے
خدا کا گھر بھی پتھر کا
بتِ عیار پتھر کے
مکاں پتھر کا اپنا
قبر پتھر کی
سرہانے نام کی تختی بھی پتھر کی

محسنِ انسانیت

مجسّم نورِ نورِ اولیں کی جب ولادت کی گھڑی آئی
اندھیرے دم بہ خود حیراں یہ کیسی روشنی آئی

ختم المرسلیں جو آخری پیغام لائے ہیں
رہیں گے حشر تک روشن چراغ ایسے جلائے ہیں

رضائے حق کی خاطر ہی ہزاروں دکھ اٹھائے ہیں
بدر میں فتح پائی ہے اُحد میں زخم کھائے ہیں

عزائم حوصلے اصحاب کے یوں بھی بڑھائے ہیں
خود اپنے پیٹ پہ باندھے ہوئے پتھر دکھائے ہیں

مُشرکوں کے واسطے پہروں ہدایت کی دعائیں کیں
جو حق کی سمت آیا معاف اسکی سب خطائیں کیں

عمل سے آپؐ نے ثابت کیا، کیا حق و ناحق ہے
اشارے پر ذرا سے آپؐ کے دیکھو قمر شق ہے

عظیم المرتبت عالی مقامی کے خطاباتِ جہاں کیا ہیں
حدِ جبرئیل سے آگے بھی جتنے باب تھے وا ہیں

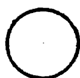
بہ جُز اَللہُ اکبر کونسا پرچم تھا ہاتھوں میں
دُکھی انسانیت کے زخم کا مرہم تھا ہاتھوں میں

محبت سارا عالم ہے

محبت ہی محبت سارا عالم ہے
محبت ہی محبت روحِ آدم ہے
محبت ہی محبت

بندوں کا خدا کے ساتھ رشتہ ہے
دعاؤں کا اثر کے ساتھ رشتہ ہے
یہ کیسا امتیاز آپس میں کرتے ہو
زمیں کو تم لکیریں کھینچ کر تقسیم کرتے ہو
محبت سارے عالم سے ہی فخرِ آدمیت ہے
محبت نسلِ انسانی کا ہی ورثہ نہیں یارو
محبت تو درندوں اور پرندوں میں بھی ہوتی ہے
محبت ہی عظیم عطیہ ہے یارو دستِ قدرت کا
محبت ہی وطن کی بانٹتی ہے کربِ ہجرت کا
محبت سے جو عاری ہیں وہ انساں بن گئے پتھر
محبت کرنیوالے دِل
حسیں جذبات سے معمور ہوتے ہیں
محبت کرنے والے دِل
خدا کا گھر بھی ہوتے ہیں

ٗ



یوں انتظار میں ہوں تمہارے کھڑا ہوا
رستے میں جیسے میل کا پتھر گڑا ہوا

ہر اک قدم پہ میرا گلا گھونٹتا ہوا
میرا ضمیر ہے، میرا قاتل بنا ہوا

اب خود کلامیاں ہی مری کائنات ہیں
ہے رابطہ تو شہر میں سب سے کٹا ہوا

مریخ و مہر و ماہ سے بھی آگے نکل گیا
انساں خدا کے نقشِ قدم ڈھونڈتا ہوا

پتھر برس رہے ہیں سزا کس جنم کی ہے
ہوں پیڑ راستے کا پھلوں سے لدا ہوا

٭



ہاتھ میں ہمارے اِک پھلجھڑی غنیمت ہے
ظلمتوں کے سینے میں کھلبلی غنیمت ہے

آپ کی جُدائی میں ایک عُمر تڑپیں گے
قُرب یہ مِلا ہے جو دو گھڑی غنیمت ہے

ہمسفر سمندر کے کیا ہوئے خدا جانے
میں ہوں اِک جزیرے کا آدمی غنیمت ہے

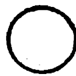
برف کی طرح پگھلا سب غرور جسموں کا
کچھ لطیف جذبوں میں آگ سی غنیمت ہے

نرمیاں محبت کی دِل کو جیت لیتی ہیں
نفرتوں کے صحرا میں دوستی غنیمت ہے

زندگی گزار آیا کرب ناک چیخوں میں
یہ خموشی تنہائی قبر کی غنیمت ہے

برہمی یہ آپس کی یہ نفاق اے وصفی
اِک خلوص ایسے میں باہمی غنیمت ہے

٭



لفظ جو بھی زبان سے نکلا
تیر بن کر کمان سے نکلا

کامراں امتحان سے نکلا
راستہ درمیان سے نکلا

اصلی چہرہ کو چھوڑ کر گھر پر
نقلی چہرہ مکان سے نکلا

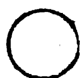
تھا ہتھیلی پہ دل کا نذرانہ
بوالہوس کیسی شان سے نکلا

یہ نگینہ مری انگوٹھی کا
چاند کی اِک چٹان سے نکلا

بلبلے میں سمندروں کا غرور
یہ اُسی خاندان سے نکلا

بھیڑ میں راستہ کہاں ملتا
وہ تو زورِ بیان سے نکلا

۞



شانوں تک آ کے وار اَدھورے پلٹ گئے
سعیٔ بقا میں سَر تو بچا، ہاتھ کٹ گئے

صحرا کی خاک پر تھا یہ سیلاب کا کرم
ذرّے یہاں کے کتنے جزیروں میں بَٹ گئے

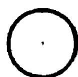
طوفاں کا پیش خیمہ تھا موجوں کا اِضطراب
لہراتے بادبان سمندر سے ہٹ گئے

سینہ بہ سینہ یاد فقیروں کی رَہ گئی
شاہوں کے نام صفحۂ ہستی سے مٹ گئے

آواز اُٹھائی ہم نے ہی ہر ظلم کے خلاف
ہر تیغِ جبر و جور سے تنہا لپٹ گئے

اَمن و اماں میں گذری اندھیروں میں اے ضمیرؔ
آئی سحر تو لوگ اُجالوں میں لُٹ گئے

٭



شہر تھے نہ صحرا تھے
بے چراغ قریہ تھے

نام کا سمندر ہم
کام کا وہ دریا تھے

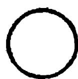
رہ نُما تھے جتنے بھی
راستے کا دھوکہ تھے

اک دہکتے صحرا میں
ہم مہکتا جھونکا تھے

پُر خطر سمندر میں
خوش نُما جزیرہ تھے

آندھیوں کی زد پر ہم
بے طناب خیمہ تھے

❁



دریا ہے طُغیانی پر
ضِد ہے کشتی رانی پر

تُف ایسی سُلطانی پر
پہرہ دانہ ، پانی پر

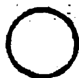
چلتے پھرتے ساگر کا
دھوکا پارِ جانی پر

دِل نے دھڑکنا چھوڑ دیا
آنکھوں کی حیرانی پر

کل کیا ہونے والا ہے
لکھا ہے پیشانی پر

بھیگی بھیگی خوشبو سی
شبنم رات کی رانی پر

⁂



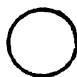
شور موجوں کا سمندر میں بپا ہو جیسے
کوئی آسیب جزیروں میں چھپا ہو جیسے

شب کے سناٹے میں پائل کی صدا ہو جیسے
کوئی شیشہ کسی پتھر پہ گرا ہو جیسے

دشت میں تھی کوئی آواز تعاقب میں میرے
گونجتی گنبدِ بے در میں صدا ہو جیسے

کامراں تین سو تیرہ تھے ہزاروں میں ضرور
شاملِ حال پیمبر کی دعا ہو جیسے

❖



سورج کی لٹکتی ہوئی تلوار مِلے ہے
سایہ نہ کہیں دشت میں دیوار مِلے ہے

کٹتی ہے زباں حق کی، حقائق پہ ہے پہرہ
باطل کی وہی گرمیٔ بازار مِلے ہے

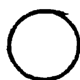
اِک حشر اُٹھاتی ہے دمِ رقص وہ قامت
رس گھولتی پازیب کی جھنکار مِلے ہے

واقف نہیں مجھ سے تو کوئی شہر میں ترے
دشمن نہ یہاں، دوست نہ غمخوار مِلے ہے

اِس شہر میں اِنسان کی قیمت نہیں کوئی
مٹّی کے عوض درہم و دِینار مِلے ہے

غم میں تو گزر جاتی ہے آرام سے وصفی
اُمیدِ مسرّت ہی سے آزار مِلے ہے

٭



گھٹ کے اس حبس میں مرنا ہی مقدر ہے میرا
دشت کا خشک کنواں مسکنِ آخر ہے میرا

مجھے تلاش نہ کر قید ہونے والوں میں
فصیلِ شہر پہ لٹکا ہوا تو سر ہے میرا

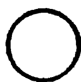
دہکتی آگ پہ وہ امتحان لیتے ہیں
سلگتی راہوں پہ ہر روز ہی سفر ہے میرا

میں پتھروں سے مخاطب رہا ہوں برسوں تک
صدائیں کندہ ہیں اُن پہ یہی ہنر ہے میرا

خیال لفظوں میں ہے جیسے سیپ میں موتی
صدف کے پردہ میں پوشیدہ یوں گہر ہے میرا

ہے بات میری مکمل تو دونوں مصرعوں میں
احاطہ چند ہی لفظوں میں مختصر ہے میرا

⁘



ناز جس ہستی پہ ہے اُس کی حقیقت کیا کہوں
روح کو پنچھی کہوں اور جسم کو پنجرا کہوں

سبز جو تھے زرد ہو کر ٹہنیوں سے جھڑ گئے
اس تغیر کو کرم اک اور پت جھڑ کا کہوں

خون کے دریا رواں تھے اک جزیرے میں کئی
اک دیو کی تلوار کو دریاؤں کا منبع کہوں

ہمسفر سند باد کے ہم بھی رہے ہیں اے فرد
ثمر تھے شاخوں پر ہزاروں پیڑ کو تنہا کہوں



کب سکوں میں زندگی اچھی لگی
کرب اُلجھن بے کلی اچھی لگی

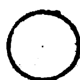
بے دری ، بے چارگی اچھی لگی
در بہ در آوارگی اچھی لگی

گھاس گھوڑے کی کبوتر کھا گئے
خشک موسم میں ہری اچھی لگی

شہر کے پاس آ کے گندی ہو گئی
دور جنگل میں ندی اچھی لگی

نرغۂ باطل میں زیرِ تیغ بھی
حق کے ہونٹوں پر ہنسی اچھی لگی

ذہن میں آسیب تھا کوئی مُصِر
چیز جو بھی تھی بُری اچھی لگی



ذات کے الاؤ میں جل رہا ہوں رات دن
اِک دہکتی آگ پر چل رہا ہوں رات دِن

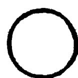
لمحہ لمحہ جھیلتا ہوں کربِ برگِ زرد کا
آندھیوں میں پیڑ ہوں، ہِل رہا ہوں رات دِن

قافلوں کو راستے دِکھا رہا ہوں دشت میں
تھوڑی دور آگے آگے چل رہا ہوں رات دن

کشید کر کے مجھکو کیوں صُراحیوں میں بھر دیا
ساغروں میں وقت کے ڈھل رہا ہوں رات دِن

سُن رہا ہوں آہٹیں کِس کی چاپ ہے ضرر
کِس خرامِ ناز سے بہل رہا ہوں رات دِن

⁘



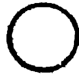
اے تیز موجِ تلاطم اُچھال دے مجھ کو
میں پانیوں میں گھرا ہوں نکال دے مجھ کو

خوشی کے بعد نہ رنج و ملال دے مجھ کو
عروج دے کے نہ ہرگز زوال دے مجھ کو

پھر اُٹھوں گا' ذرا اشتعال دے مجھ کو
نحیف جان کے ہرگز نہ ٹال دے مجھ کو

میری جبیں پہ ترے در کی خاک رہنے دے
کوئی خطاب نہ تمغہ' نہ شال دے مجھ کو

٭



دکھتی رگوں پر ضرب لگایا نہ کیجئے
احسان کر کے آپ جتایا نہ کیجئے

کل سر پھری ہوا سے درختوں نے یہ کہا
زیور تو لُٹ چکا ہے ستایا نہ کیجئے

رُو پوش جھاڑیوں میں لُٹیرے نہوں کہیں
یوں رہ گزر پہ خاک اُڑایا نہ کیجئے

چھتری سے دور ہو کے کبوتر بھٹک گیا
اپنی حدوں کو چھوڑ کے جایا نہ کیجئے

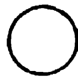
ٹہنی سے برگِ زرد کا شکوہ فضول تھا
تبدیلیوں کا ڈھونگ رچایا نہ کیجئے

کافی ہے دو منٹ کی خموشی خراج کو
اِک عُمر اس کا سوگ منایا نہ کیجئے

فن کی نزاکتوں کا بھی لازم ہے احترام
چکّی کا گیت ڈھول پہ گایا نہ کیجئے

مظلوم کے حمایتی بن کے اُٹھو ضرور
ظالم کے حوصلوں کو بڑھایا نہ کیجئے

✣



تعلق اُن سے اگر استوار کرنا ہے
سمندروں کا سفر اختیار کرنا ہے

دِکھا کے زخم اُنہیں غمگسار کرنا ہے
سُنا کے قصّۂ غم اشکبار کرنا ہے

کرم کی بھیک نہ کچھ انکسار کرنا ہے
عیاں تو مجھ کو میرا حالِ زار کرنا ہے

سپاٹ لفظ کو خنجر کی دھار کرنا ہے
لہو ہے جتنا بدن میں نثار کرنا ہے

یزیدِ عصر پہ ایک تازہ وار کرنا ہے
عبائے مکر و رِیا تار تار کرنا ہے

غموں میں گِھر کے ضررِ غم کا سامنا کیجئے
یہ بُزدلی کی علامت فرار کرنا ہے

٭



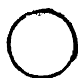
کیوں موج مضطرب ہے، سمندر اُداس ہے
قیدِ صدف میں کیا کوئی گوہر اُداس ہے

ناکامیوں پہ آپ نہ ہوں اِس قدر ملول
دُنیا کو فتح کر کے سکندر اُداس ہے

ہر گام پر چراغِ ہدایت کے باوجود
اُمت کی گمرہی پہ پیمبر اُداس ہے

دھارے خوشی کے پھوٹتے ہیں غم سے ، پھر بھی
بے وجہ کیوں غموں کا مقدّر اُداس ہے

⁂



اِک جبر، جور، ظلم، دغا میرے ساتھ ہے
میں مطمئن ہوں جیسے خدا میرے ساتھ ہے

چادر سی تانے سر پہ گھٹا میرے ساتھ ہے
صحرا میں آج ماں کی دُعا میرے ساتھ ہے

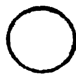
سورج، زمین، چاند، ستارے یہ آسماں
شاہکار میں ہوں سب کی بقا میرے ساتھ ہے

کرتا ہوں کسبِ نور اِسی روشنی سے میں
روشن چراغِ آلِ عبا میرے ساتھ ہے

یہ تخت و تاج ہیچ ہیں سب میرے سامنے
میں وہ گدا ہوں ظلِ اِلٰہ میرے ساتھ ہے

اِک پھانس سی ہے سینے میں اٹکی ہوئی ضرور
احساس کیا ہے؟ ایک بلا میرے ساتھ ہے

⁂



راہ میں جب آندھیوں کا سامنا ہو جائے گا
اِمتحاں ہر حوصلے کا برملا ہو جائے گا

مرحلہ در مرحلہ طے فاصلہ ہو جائے گا
خیمہ زن منزل پہ اِک دن قافلہ ہو جائے گا

سربلندی کا فسانہ خاک پا ہو جائے گا
کل کھنڈر ہوگی عمارت راستہ ہو جائے گا

سر برہنہ زندگی، یہ دشتِ غم، یہ بے گھری
سایہ بگولے کا بھی اِک ظلِّ ہما ہو جائے گا

شعر میں شامل نہ ہو جب تک کہ خونِ دِل ضرر
بازی گری الفاظ کی اِک شعبدہ ہو جائے گا

❖



قبر کی ظلمت میں بھی آیا میرے پیچھے
رہتا تھا تعاقب میں جو سایہ میرے پیچھے

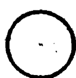
ہے عکس جو کردار کا دُھندلا میرے پیچھے
دیکھے گی اسی میں مجھے دُنیا میرے پیچھے

گم راہ کوئی راہ سے اب ہو نہیں سکتا
ہے صاف چمکتا ہوا راستہ میرے پیچھے

سیلابِ بلا کی ہے ہر اِک موجِ تلاطم
مضبوط چٹانیں بھی ہیں تِنکا میرے پیچھے

پیاسا ہوں میں صدیوں سے پلٹ کر نہیں دیکھا
حالانکہ بہا کرتا ہے دریا میرے پیچھے

❖

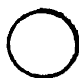


تھا پیٹ کا سوال ارادے سفر کے تھے
مجبور ہجرتوں پہ سبھی لوگ گھر کے تھے

جھونکے کچھ اتنے تیز نسیم سحر کے تھے
نو اُمیدہ غنچے سبھی دربدر کے تھے

کندہ نقوش تیشۂ فکر و نظر کے تھے
احسان پتھر دلوں پہ بھی دستِ ہنر کے تھے

بنتے وہ کاش میری اُڑانوں کے ہمسفر
زنداں میں جو شریکِ غمِ بال و پَر کے تھے



لمس لے کے قربت کا جب ہوا سنکتی ہے
خوشبوؤں سے اِک دُنیا دیر تک مہکتی ہے

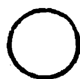
پھول اور کانٹے میں، سچّے اور جھوٹے میں
فرق کاش کر لیتی آگ جب بھڑکتی ہے

سرگراں سی رہتی ہے اِک عقاب کی مانند
دشت میں سرابوں پر جب نظر بھٹکتی ہے

چھپ کے چلنے لگتا ہے چاند بھی گھٹاؤں میں
زُلف اُن کے چہرے سے جب ذرا سرکتی ہے

حوصلہ ہنر سیکھو برق سے چمکنے کا
تیرگی کے سینے کو چیر کر چمکتی ہے

٭



لہو رگوں میں نہیں زہر سا رواں ہے کوئی
حیات میرے لئے سخت امتحاں ہے کوئی

میں جلتا رہتا ہوں ہر پل عجیب آگ سی ہے
دہکتے شعلے نہ اُٹھتا ہوا دھواں ہے کوئی

بھٹک کے رہ گیا اِک ایسے دشت میں کہ جہاں
کسی جرس کی صدا ہے نہ گردِ کارواں ہے کوئی

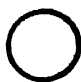
زمیں کے ساتھ بہ حدِ نگاہ سَر پہ میرے
ستون جس میں نہیں ایسا سائباں ہے کوئی

میں کر سکا نہ اگر امتیازِ نیک و بد
جھنجوڑ دیتا ہے اِک شخص درمیاں ہے کوئی

پرندہ زخمی، سفر بے کراں سمندر پر
جزیرہ ہے نہ شجر، شاخ، آشیاں ہے کوئی

صدا جواب میں آتی ہے پتھروں سے ظفرؔ
پہاڑ بولتے ہیں ان کی بھی زباں ہے کوئی

❖



اَنداز دِل رُبائی کے سارے غزل میں ہیں
ٹوٹے ہوئے دِلوں کے سہارے غزل میں ہیں

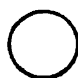
تاریخ، فلسفہ ہو کہ مذہب، سیاسیات
ہر علم کے لطیف اِشارے غزل میں ہیں

کشمیرِ بے نظیر سے پنجاب و سندھ تک
تہذیب ہند و پاک کے دھارے غزل میں ہیں

شادابیاں گلوں کی، وہ تِتلی کا حالِ زار
آسودہ حال، رنج کے مارے غزل میں ہیں

اِک آتشِ خموش ہے دہکی ہوئی ضرور
کوئی دھواں نہ آگ شرارے غزل میں ہیں

٭



پہن کر جُبّہ و دستار جب بھی خواجگی آئی
پئے تعظیم بڑھ کر مسندِ سجادگی آئی

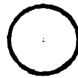
غموں کی تیز دھوپوں میں مہکتے قرب کے لمحے
فسردہ زرد چہروں پر ذرا سی تازگی آئی

ستارے، چاند، سورج پیس کر لفظوں میں بھر دونگا
اگر ترسی ہوئی غزلوں کی تابش میں کمی آئی

وہ درویشی جھکا دیتی تھی سلطانی کو قدموں میں
گداؤں کی طرح کیوں ہاتھ پھیلاتی ہوئی آئی

قریب از مرگ پر جیسے مسلسل کرب کا عالم
مرے حصّے میں اے وصفی اِک ایسی زندگی آئی

⁂



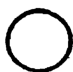
یہ کرب میرے لئے قہر بنتا جاتا ہے
لہو رگوں میں میری زہر بنتا جاتا ہے

مٹا کے رکھ دے گا بے رحم قاتلوں کا وجود
یہ بے گنہ کا لہو، بحر بنتا جاتا ہے

لہو بہا ہے جہاں حق کے واسطے اپنا
وہاں کی خاک کا ذرہ بھی مہر بنتا جاتا ہے

ہوا تھا قریہ کبھی نام سے ترے آباد
عظیم تر وہ محبت کا شہر بنتا جاتا ہے

❊



منتظر کوئی سرِ آب نہیں
ہے وہی رات ماہ تاب نہیں

اک اندھیرا ہے آفتاب نہیں
ہم میں کوئی ابو تراب نہیں

انقلابوں کا تو حساب نہیں
اک ہمیں ہیں کہ فیض یاب نہیں

غور سے پڑھئے آپ چہرے کو
اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں

زندگی آپ کی فسردہ صفی
شعر و نغمہ تو ہے شراب نہیں

❖

نذرِ صولت[1]
(تمام تر مطلعوں پر مشتمل)

تیرہ شبی کو نغموں کی دیکر سحر گیا
مرہم کو ڈھونڈتا ہوا اِک چارہ گر گیا

لے کر چراغِ فکر سرِ رہ گزر گیا
ہر ظلمتِ حیات پہ اک وار کر گیا

پیالے ہیں گردشوں میں اگر کوزہ گر گیا
لفظوں میں سب نچوڑ کے فکر و نظر گیا

خوشبو تھا ایک وہ تو فضائیں بکھر گیا
کس نے کہا کہ شاعرِ محبوب مر گیا

شہرِ نوا خموش ہے ، بابِ اثر گیا
"بزمِ سخن کا شاعرِ دوراں گزر گیا"

آوارہ برگِ خشک کی مانند ہیں ضرر
شاداب قربتوں کا وہ موسم گزر گیا



[1] بادِ صولت کے شاعرہ میں پڑھی گئی



اک بہانہ غم و خوشی کا ہے
قہر ہو یا کرم اُسی کا ہے

جسم ملبوس سے دمکتا ہوا
عکس پانی میں روشنی کا ہے

رہ نُما میں نہیں شعورِ سفر
خوف ہر لمحہ گمرہی کا ہے

کوئی برتر نہ کوئی کمتر ہے
صرف احساس برتری کا ہے

در بہ در کی ہے خاک چہرے پر
مجھ پہ احسان بے گھری کا ہے

وجہِ تخلیقِ کائنات فنسر
امتحاں جیسے آدمی کا ہے

☆



ریت سے ہے بکھری ہوئی دریا میں، دریا گم ہوا
زد میں جو سیلاب کی آیا وہ قریہ گم ہوا

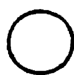
شخصیت کو روند ڈالا ہجرتوں کے کرب نے
شور میں شہروں کے آکر نرم لہجہ گم ہوا

شہر میں سورج کے آکر جسم روشن ہو گئے
تھا جو صدیوں کا مقدر وہ اندھیرا گم ہوا

رات کی رانی مہک کر جس کو گرماتی رہی
صبح وہ خوشبو میں ڈوبا شاہ زادہ گم ہوا

تخیلص میں آکر زمیں کروٹ بدل کر رہ گئی
جانا پہچانا جو تھا برسوں کا جادہ گم ہوا

ہر ورق بکھرا ہوا ہے اب کتابِ زیست کا
وقت کی آندھی میں دیکھو کیا بچا، کیا گم ہوا



چشمہ ندی نہ جھیل نہر کچھ نہیں ہے پاس
میلوں چلو تو گاؤں شہر کچھ نہیں ہے پاس

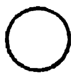
مُدت سے ساتھ تھی جو انگوٹھی بھی گُم ہوئی
کھانے کے واسطے بھی زہر کچھ نہیں ہے پاس

ساکت، کنوئیں کے پانی کی مانند آج ہوں
وہ اضطراب موج و لہر کچھ نہیں ہے پاس

سب کچھ بہا کے لے گیا سیلاب اپنے ساتھ
اُس کا ثبوتِ ظلم و قہر کچھ نہیں ہے پاس

کائی نہ کف ہے ریت کا صحرا ہے دور تک
کوئی صدف نہ سیپ گہر کچھ نہیں ہے پاس

شب چراغ



شب کا سنّاٹا شورِ سگاں
جیسے نکلا ہو، انبوہِ آوارگاں

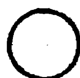
مطمئن قلب آسودہ ذہنی کہاں
لمحہ لمحہ بھنور کی طرح سرگراں

جھنک پائلوں کی تھی طرفہ فغاں
کیسے ٹوٹے سماعت پہ کوہِ گراں

ذوقِ اظہار کی کارفرمائیاں
ہر عضوئے بدن بن گیا ہے زباں

تازہ جھونکے ہواؤں کے آئے ضرور
سوچتی رہ گئیں نیم وا کھڑکیاں

٭



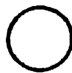
ذرا سی دیر میں قسمت سنور بھی سکتی ہے
لکیر دھن کی جبیں پر اُبھر بھی سکتی ہے

سمندروں کی طرح سے بپھر بھی سکتی ہے
حدوں کو توڑ کے ندی گزر بھی سکتی ہے

بقا کا حکم بھی دے گا فنا کے بعد خدا
نہ مر سکے گا کوئی موت مر بھی سکتی ہے

فساد، فتنے ہیں، سازش کا زہر پھیلا ہے
یہ موتیوں کی لڑی پھر بکھر بھی سکتی ہے

❊



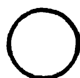
ورق ورق پہ کوئی ماہ تاب ہو جیسے
سحر کے ہاتھوں میں شب کی کتاب ہو جیسے

صبا کے جھونکوں سے کھلتا گلاب ہو جیسے
وہ تازگی کہ تمہارا شباب ہو جیسے

یقیں ہو تو ہر اک شئے سے معجزہ ہے عیاں
یقیں نہ ہو تو وہ دیوارِ آب ہو جیسے

لرز گئی ہے زمین آج خونِ ناحق سے
ضمیرِ ارض میں اِک اضطراب ہو جیسے

٭



اتنے برسائے ہیں عدو پتھر
در بہ در سنگ ، کو بہ کو پتھر

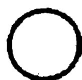
قتل کا دیکھئے ثبوت اِن پر
جذب کرتے نہیں لہو پتھر

خون بکھرا ہوا ہے سڑکوں پر
راستے کے ہیں سُرخ رو پتھر

سامنا ترکِ رسم و راہ کے بعد
جیسے ہوں کوئی دو بہ دو پتھر

بہہ گئی سب شرابِ ناب ضرور
خُم تھے شیشے کے اور سُبو پتھر

٭



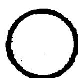
غم سے ہر اک نڈھال ہے یارو
کون آسودہ حال ہے یارو

علم و دانش ہُنر مشینوں میں
آدمی خستہ حال ہے یارو

انتہائے کمال کو پہونچا
ابتدائے زوال ہے یارو

سبز سے زرد ہوگیا وہ مصحفیؔ
گردشِ ماہ و سال ہے یارو

❖



وہ بدن سُرخ سرِ شام شفق ہو جیسے
چہرہ قامت پہ جواہر کا طبق ہو جیسے

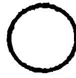
اجنبی کا وہ نگاہوں سے مُسلسل پڑھنا
کوئی بھولا ہوا مکتب کا سبق ہو جیسے

ایسے چہرے بھی نگاہوں سے گزر جاتے ہیں
کوئی تحریر نہیں، سادہ ورق ہو جیسے

سلطنت بخش کے، لوگوں کو فقیری میں مگن
وہ سخی ایسا شہنشاہِ بلخ ہو جیسے

حوصلے آج جواں ہیں جو ضرر و ضعفی سے
چہرہ سنگینیٔ حالات کا فق ہو جیسے

⁘



ٹہنی پہ تھوڑی دیر کا مہماں ہے برگِ زرد
پھر کو بہ کو فضاؤں میں رقصاں ہے برگِ زرد

صحرا بہ صحرا خاکِ گلستاں ہے برگِ زرد
اک یادگارِ فصلِ بہاراں ہے برگِ زرد

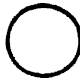
آوارگی میں جوشِ جنوں اوج پر ہے آج
ہے جس جگہ بھی حشر بہ داماں ہے برگِ زرد

مانوس ہے خوشی سے، غموں سے ہے آشنا
تکمیلِ ذات، بے سروساماں ہے برگِ زرد

آندھی میں کچھ چراغ، سے جلتے ہوئے ملے
کربِ انا سے شعلۂ عریاں ہے برگِ زرد

روشن ہے تجربات کی ہر رہ گزر مگر
صحنِ چمن میں صاحبِ عرفاں ہے برگِ زرد

⁘



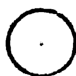
ماتم بے چہرگی کیا ہو کہیں درپن نہیں ملتے
خیالوں کو یہاں لفظوں کے پیراہن نہیں ملتے

زمین تنگ ہو چکی ہے ہم خلاؤں میں بھٹکتے ہیں
اگر بن باس لینا چاہیں بھی تو بن نہیں ملتے

ہزاروں لوگ ملتے ہیں شناسائی پرانی ہے
یہ کیسا سانحہ ہے تن ملے اور من نہیں ملتے

ترستے ہیں یہاں تازہ فضاؤں کیلئے انساں
مکاں مل جائے بھی تو شہر میں آنگن نہیں ملتے

❖



اُجڑی ہوی اجداد کی میراث کے گوشے میں ہوں
وہ حویلی اب کہاں دیوار کے سائے میں ہوں

تنگ دستی، کرب ناداری سے مل جائے نجات
خوابیدہ قسمت جاگ اُٹھے مصروف پھر جوئے میں ہوں

جھاگ بن کر رہ گیا ہوں زد پہ موجوں کی رواں
خوبصورت کچھ چٹانوں پر تھرکتا جھومتا نشے میں ہوں

چاہتوں میں فاصلے تھے، درمیاں تھی اک خلیج
کچا گھڑا اور تیز موجیں موت کے نرغے میں ہوں

پائمالی کا مری الزام اُس کے سر گیا
ٹھوکریں کھاتا ہوا ہر شخص کی رستے میں ہوں

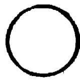
مجھ سے واقف ہے نہ کوئی میں کسی سے آشنا
اجنبی کی طرح تنہا شہر کے میلے میں ہوں

کھوج کر ساتوں سمندر، کر کے دُنیا کا سفر
ہاتھ خالی، پا برہنہ پھر ترے کوچے میں ہوں

کربِ تنہائی نے بویا، زہر سارے جسم میں
زرد اندر زرد ہو کر ذات کے حلقے میں ہوں

چھوٹ کر ہاتھوں سے میرے پارہ پارہ ہو گیا
آئینہ ٹوٹا بھی ہے تو اُس کے ہر ٹکڑے میں ہوں

❖



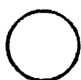
جھیل جس میں نہ کوئی چشمہ ہے
ریت ہی ریت کا وہ صحرا ہے

بات کرنا بھی اک کرشمہ ہے
بات شبنم ہے بات شعلہ ہے

ایک سنّاٹا فریۂ جاں میں
کوئی نغمہ، نہ کوئی نوحہ ہے

ناؤ کاغذ کی جیسے پانی پر
ایسی ہستی کا کیا بھروسہ ہے

آشنا کون ہے خضرؔ کا یہاں
اجنبی شہر میں وہ تنہا ہے

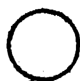


نرم و نازک گُل جیسا ہے
جسم وہ گدرے پھل جیسا ہے

ساتھ تمہارا خواب سُہانا
بیت گیا سو پَل جیسا ہے

مُجھ کو کیا گر مل سکے گا وہ
برف کی کوئی سِل جیسا ہے

قلم ہمارے ہاتھ میں وصفی
بنجر کھیت میں ہَل جیسا ہے



دن کے آفات نہ آلام لکھو
شام ناگن ہے سیہ فام لکھو

ہر خرابی کو مرے نام لکھو
مجھ کو آوارہ و بدنام لکھو

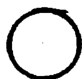
گل کی توہین سرِ عام لکھو
خس و خاشاک کو گلفام لکھو

چل پڑے ہو تو ٹھہرنا کیسا
لطف چلنے کا بہ ہر گام لکھو

زرد مُرجھائے ہوئے چہرے بھی
مُسکراتے ہیں سرِ شام لکھو

خاکِ یثرب ہے ہر آنکھ کا نور
اب اِسی خاک کا پیغام لکھو

⁂



تیز آندھی میں تھا اُکھڑے ہوئے خیمے کی طرح
جس نے دیکھا مجھے دیکھا ہے بگولے کی طرح

وقت دریا ہے شب و روز تلاطم، موجیں
آدمی ہے کہ بہا کرتا ہے تِنکے کی طرح

بول سکتے ہیں، نہ سُن سکتے ہیں آواز مری
بات کرتے ہیں اشاروں میں وہ گونگے کی طرح

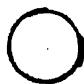
کوئی ہمدردی ہے باہم، نہ محبّت، نہ خلوص
آدمی مری صدی کا ہے درندے کی طرح

تان دیتا ہوں مخالف پہ دھوئیں کی چادر
جنگ میں جلتے ہوئے تیل کے چشمے کی طرح

پیار اِک کرب بنا، زہر بنا، قہر بنا
پیار تھا مجھ میں کبھی لمس کے نشّے کی طرح

وقت کی دھوپ، مسائل کے یہ سوکھے جنگل
میرے ہمراہ نہیں کوئی بھی شعلے کی طرح

❦



شہر تو چھوڑا صحرا چھوڑ
نقش دِلوں پر گہرا چھوڑ

خاموشی میں گُم ہو جا
ہنگاموں کا پیچھا چھوڑ

منظر سے پس منظر دیکھ
دھوکا ہے یہ دُنیا چھوڑ

راکھ بنا کر خود کو بکھیر
قبر نہ کوئی کتبہ چھوڑ

دُھوم مچا طُغیانی بن
قحطِ آب کا شکوہ چھوڑ

راہ میں روڑے مت اٹکا
خود بھی چل اور رستہ چھوڑ

سیدھا نشانہ ہوگا خطا
تیر کماں سے ترچھا چھوڑ

☆



بکھر کے رہ گئے سب بال و پر اڑانوں میں
نہ چھوڑی ہم نے تو کوئی کسر اڑانوں میں

خیال تیز ہوا کا، نہ آندھیوں کا لحاظ
نہیں تھا ہم سا کوئی بے جگر اڑانوں میں

پُھدکتے پھرتے ہیں پر تولنا نہیں آتا
بنیں گے کیا وہ میرے ہمسفر اڑانوں میں

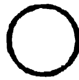


کوئی جگنو ہے کہ خنجر سا چمک جاتا ہے
قلبِ سفّاک اندھیروں کا دھڑک جاتا ہے

میری وحشت سے کہیں خوفزدہ یہ تو نہیں؟
سایہ دیوار سے کیوں تری سرک جاتا ہے

روشنی سی کوئی لہراتی ہے حلقے میں مزید
رقصِ عریاں ہے کہ شعلہ سا لپک جاتا ہے

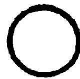
❁



تلخیاں لاکھ ہوں سینے میں چھپائے رکھنا
شمع اِخلاص کی باتوں میں جلائے رکھنا

مُسکراہٹ نئی، چہرے پہ سجائے رکھنا
ہر ملاقات کو رنگین بنائے رکھنا

کہیں مِل جائے اگر نقشِ کفِ پا اُس کا
کاسۂ چشم میں وہ خاک اُٹھائے رکھنا

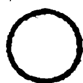


درند کو بھی یہاں اب ہراس لگتا ہے
کٹے ہیں پیڑ تو جنگل اُداس لگتا ہے

ترا یقیں تو چٹانوں کی طرح محکم ہے
میرا وجود مجھے بے اساس لگتا ہے

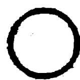
جو بات میرے گُماں میں تھی، ہوگئی پوری
یقیں سے بڑھ کے تو محکم قیاس لگتا ہے

✤



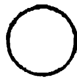
کرتے رہے اوقات بسر
ہو نہ سکی اِک سات بسر
سورج کاٹے دن کا چکّر
چاند کرے ہے رات بسر





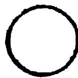
سُرخ بستیاں ہم سے
سبز وادیاں ہم سے
شاخ شاخ کونپل ہم
زرد آندھیاں ہم سے





بانسری یہ شام کی، رادھا کا یہ گھنگھرو بھی ہے
گیت نانک کا وہی، جو نغمۂ خسرو بھی ہے
خوش نما خوش رنگ پھولوں کا ہے گلدستہ کوئی
ایکتا کی سارے بھارت میں یہی خوشبو بھی ہے





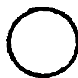
کرب لفظوں میں سمو دیتا ہوں
قطرے میں سمندر کو ڈبو دیتا ہوں
لو شمعِ صداقت کی جو تھراتی ہے
مانندِ حسینؓ اپنا لہو دیتا ہوں





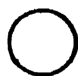
اب نہ وہ کھیت ہے نہ وہ پنگھٹ
اور نہ احباب کی ہے وہ جمگھٹ
بیتے لمحوں کی یاد میں تنہا
بیٹھ کر پی رہا ہوں کچھ تلچھٹ





شوق کی ہم سری سے ہوتی ہے
عزم کی رہبری سے ہوتی ہے
منزلِ ارتقائے کے متوالو
آگہی گم رہی سے ہوتی ہے





اُٹھ کہ جادہ ہے منتظر تیرا
تُو کہ خلوت کدہ میں سوتا ہے
منزلیں رقص کرتی آتی ہیں
جب جُنوں کار فرما ہوتا ہے





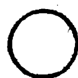
گھول دے تلخیاں ہوں جتنی بھی
پھیکی پھیکی ہے ساقیا یہ شراب
یوں غموں میں ہے زندگی میری
جیسے شعلوں کے درمیاں ہو گلاب





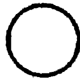
کسی صورت سے دل بہل جاتا
ہر گریباں کا چاک سِل جاتا
ذوقِ آوارگی نہ ہوتا تو
زندگی کو سکون مِل جاتا





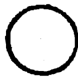
مئے عشرت نہیں ہے کیف آور
کوئی تازہ عذاب نازل کر
اِک اذیت ہے ہوش میں رہنا
دے کے اِک تلخ جام غافِل کر





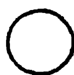
اک غمِ بے ثبات نے مارا
آرزوئے نجات نے مارا
التفاتِ اجل سے کیا مرتے؟
التفاتِ حیات نے مارا





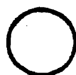
عزم منزل جگا کے چلتا ہوں
خود کو رہبر بنا کے چلتا ہوں
رہزنوں کی نگاہ سے بچکر
نقشِ پا کو مٹا کے چلتا ہوں





ترے آنچل کا یہ رنگین سہارا نہ ملے
تری نظروں سے کوئی جام دوبارا نہ ملے
ایک لمحہ بھی تری یاد سے غافل جو رہوں
زندگی بھر میری کشتی کو کنارا نہ ملے





کیوں ہے تری اُمنگ خوابیدہ
ارتقا جہد میں ہے پوشیدہ
دیکھ اے ذوقِ آذری اب بھی
سینکڑوں بُت ہیں ناتراشیدہ



متفرق اشعار

کیا اثر دکھلائے اب نغمہ نوا کچھ بھی نہیں
ہے گلا روندھا ہوا اب تار ہیں ٹوٹے ہوئے

—...—

اُن کا خیال اُن کا تصوّر اگر نہیں
دار و رسن کی بات بھی کچھ معتبر نہیں

—...—

عطائے دستِ قدرت ہے، جو مل جائے غنیمت ہے
تعیّن کی حدوں سے تو یہاں بڑھ کر نہیں ملتا

—...—

رائج الوقت نصابوں کی طرح
ہم ہیں ہاتھوں میں کتابوں کی طرح

—...—

ہر لمحہ اضطراب تھا، ہر پل تھی اک چبھن
احسان مجھ پہ یہ تو کسی تسمہ پا کا تھا

جب بھی سرک گئی ہے زمیں پاؤں سے میرے
مجھ کو سہارا صرف مخالف ہوا کا تھا

اُس نے جب اپنے جُرم سے انکار کر دیا
بپھرے ہوئے ہجوم نے سنگسار کر دیا

دشمن فصیلِ شہر کے باہر تھا خیمہ زن
اندر سے کس نے شہر کو مسمار کر دیا

اُمید یوں کرم کی ہے جبر و قہر کے بعد
جیسے خیالِ شام کڑی دوپہر کے بعد

جیون بیتا عیش میں ایسے
مست ہو ناگن رقص میں جیسے

دھوپ اور چھاؤں میں ایسے گزری
عکس سے کھیلے بالک جیسے

سورج کی ایک ایک کرن کو ترس گئی
ڈوبی ہوئی کہُر میں، برف کی چٹان ایک

وصفی مِلا نہ آبلہ پائی کا کچھ مزہ
کانٹے ہماری راہ کے کتنے بخیل تھے

در بہ در آوارگی سے باز آنا چاہیئے
آدمی ہو یا پرندہ اِک ٹھکانہ چاہیئے

لوگ قبروں پر لگا دیتے ہیں کتبہ نام کا
گھر پہ اپنے نام کی تختی لگانا چاہیئے

...

اِک سپیرے کی پٹاری میں مُقیّد رہ کر
بین کی لہروں پہ ناگن کو تھرکتے دیکھا

مچھلیاں جال میں لے کر جو مچھیرن نکلی
اِس خیانت پہ سمندر کو بپھرتے دیکھا

...

تھک کے وحشت سے ذرا خاک پہ سر رکھا تھا
خیر مقدم کو چلے آئے ہیں کچھ دشت نئے

یادیں مہکی ہیں ضرر رات کی رانی کی طرح
اُن کے مکتوب ہوئے آج جو ہمدست نئے

...

اِس خرابے میں بسر کی اِس طرح ہم نے ضرر
جیت کو بھی کہہ دیا کہ یہ تو اپنی مات ہے

...

جھونک دو تلخیٔ زمانے کی ہمارے جام میں
آگ پیتے ہیں کسی زہر سے ڈرتے نہیں

حوصلہ خیبر شکن کا جن میں ہوتا ہے ضرور
وہ چٹانوں کی طرح سیلاب سے ڈرتے نہیں

....

خود میرے قتل کی دُنیا کو گواہی دینے
کفِ قاتل پہ میرے خون کا دھارا ہوگا

بجلیو! میں نے نشیمن کی بنا رکھی ہے
سامنا تم سے پھر اِک بار دوبارا ہوگا

ناخداؤں کی رعونت کا بھرم ٹوٹا ہے
پھر کسی ڈوبنے والے نے پکارا ہوگا

....

ہر ایک شخص یہاں غرقِ کرب ہو جیسے
حیات گھر سے سمندر کا ہے سفر تنہا

سلیقہ ہو تو نکھرتا ہے منفرد انداز
بنانے والے بناتے ہیں رہگذر تنہا

....

دل ہو چکا ہے ہر غمِ ہستی سے پاش پاش
مردہ ہے اب ضمیر تو احساس سرد لاش

....

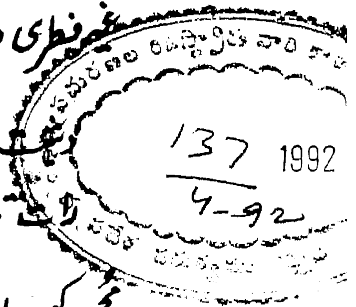
گھُٹی فضاؤں میں خوف و خطر کے سائے ہیں
شجر پنپ نہیں سکتا شجر کے سائے میں

....

راہ میں پیڑ بھی مل جائے تو سایہ ہے حرام
سخت دشوار ہے منزل کی طلب جانتے ہیں

زندہ رہنے کا سلیقہ جنھیں آیا نہ ضرر
غیر فطری وہ کوئی موت کا ڈھب جانتے ہیں

....



دشت میں ایک بگولہ جیسے
رات تاروں میں قمر ہے تنہا

....

مجھ کو بے گور و کفن چھوڑ کے قاتل میرا
درِ حاکم پہ طبق میں لئے سر آیا ہے

....

تمام کرب بدن کا نچوڑ آنکھوں میں
ذرا سا رحم ہو پیدا کٹورہ آنکھوں میں

....